

نظامِ اسلامی اور اطاعتِ رسولؐ

منعیمی صدیقی

(۳)

تیسرے کتاب کے چار شعبے | نبی صلعم کا منصب یہ بتایا گیا ہے۔ اور متعدد مقامات پر بتایا گیا ہے۔ کہ:

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُكَفِّهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ
الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ (جمعہ: ۱۱)

وہ (یعنی نبی صلعم) ان کو اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھ کر سناتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے، ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔
کوئی معقول آدمی اس آیت پر نظر ڈال کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس میں نبی صلعم کا ایک ہی فرض الفاظ بدل بدل کر اور تراویحات کو استعمال کر کے سامنے لایا گیا ہے، بلکہ ہر ایک سمجھ سکتا ہے کہ تلاوت آیات اور تزکیہ اور تعلیم کتاب و حکمت، فرائض نبوت کے ایسے شعبے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک اپنی مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ اب آئیے، ان میں سے ہر شعبے پر کسی قدر تفصیل سے نگاہ ڈالیں۔

اس آیت نے فرائض نبوت چار بیان کیے ہیں، ان کو ہم سہولت تو ضیح کے لیے ایک بدلی ہوئی ترتیب کے ساتھ (جو دعائے ابراہیم میں پائی جاتی ہے۔ بقدرہ ۱۵) سامنے رکھتے ہیں:-

۱) تلاوت آیات (۲) تعلیم کتاب (۳) تعلیم حکمت (۴) تزکیہ

تلاوت آیات | نبی صلعم کا پہلا فرض یہ ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے آیات الہی کی تلاوت فرمائیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جو کچھ آیات قرآنی آپ پر نازل کی ہیں، اور جب جب کی ہیں، اور جس جس ترتیب سے کی ہیں ان کو جوں کاتوں بندگانِ خدا تک پہنچادیں۔ آیات کو جوں کاتوں پہنچانے کی ذمہ داری جو نبی صلعم پر عائد کی گئی تھی اس کی نزاکت کا اندازہ ذیل کی آیت سے ہو سکتا ہے:-

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ
اور اگر وہی صلعم، گھڑ لانا اپنی طرف سے ہم پر کوئی بات

لَا خَدُّ نَائِمَةٌ بِالنَّيْمِينَ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ
 التَّوَيْتِينَ۔
 تو ہم پکڑتے اس کو دلہنے ہاتھ سے، اور کاٹ ڈالتے
 اس کی شاہ رگ۔

اسی نازک ذمہ داری کا احساس تھا جس کے تحت نبی صلعم بسا اوقات تشویش فرماتے تھے اور یہ تعاقبات
 بشریت اس فکر میں رہتے تھے کہ کہیں کوئی لفظ بھول نہ جائیں، کہیں حافظہ کوتاہی نہ کر جائے، کہیں ترتیب میں
 فرق نہ آجائے۔ لیکن اس تفکر اور اس تشویش سے نجات دلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت کو اطمینان
 دلایا کہ لَا تَحْتَرِكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ط إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ۔ یعنی آپ فکر میں نہ پڑیں
 جلدی سے اس کو یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دیں، اطمینان سے وحی کو اخذ کریں، اس کو آپ کے
 ذہن میں ترتیب کے ساتھ محفوظ رکھنا اور اس کی تلاوت ٹھیک ٹھیک کر دینا خود ہمارے ذمہ رہا یہ ہمارا
 اپنا کام ہے اور اس کے لیے ہم خود خاص اہتمام رکھتے ہیں!

اس فرضیہ تلاوت آیات کی ادائیگی بھی اللہ تعالیٰ کو قاصدانہ انداز سے مطلوب نہیں تھی بلکہ پیغمبرانہ
 اور داعیانہ انداز سے مطلوب تھی؛ یعنی چاہا یہ گیا ہے کہ تلاوت آیات اس انداز سے ہو کہ ایک جاندار
 دعوت وجود میں آئے، تلاوت محض پڑھ دینا اور بول دینا نہ ہو بلکہ اس کے اندر داعیانہ جذبات گھلے ہو
 اس میں مخاطب کے ذہن میں نقوذ کرنے اور اس کے افکار و نظریات کو تہ و بالا کرنے کی طاقت ہو، وہ ایک
 ذہنی تحریک بن کے فضا میں طاری و ساری ہو جائے۔ طوطے کی طرح پڑھنا مطلوب نہیں تھا، اور قاصد کو
 تو طوطا ہی ہونا چاہیے! تلاوت آیات کی جو نوعیت مطلوب تھی اس کا مطالبہ مختصراً اللہ تعالیٰ نے
 ان الفاظ میں کیا ہے کہ وَرَقِلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلاً۔ قرآن پڑھا جائے اور آیات سنانی جائیں تو ایک قاصد کی
 طرح بے جان الفاظ نہ اُٹھ دیے جائیں، بلکہ بولنے کا انداز موثر ہو، اس میں کلام کے لیے سچا جذبہ عقیدت
 و تصدیق موجود ہو، لہجہ اور تلفظ درست ہو، تجوید کے تقاضے پورے ہوں، اوقاف اور سکوت کے مقامات
 کا لحاظ ہو، آواز کا اتار چڑھاؤ معانی کے ساتھ ساتھ واقع ہو، اور آیات پستے جذبات کی لہروں پر تیرتی
 ہوئی ہر طرف چھا جائیں۔ یہ بات تھی جسے اللہ تعالیٰ نے چار لفظوں میں سمیٹ کر اپنے نبی کے سامنے رکھا
 اور نبی نے ان چار لفظوں سے وہ سارا مفہوم اخذ کر لیا جسے آج ہم خواہیں نبی سے نمونہ ترتیل اخذ کیے بغیر

از خود کبھی نہ سمجھ سکتے !

اب اگر نبی کی پوزیشن محض پیغام پہنچانے والے کی ہوتی تو بس اس کا کام یہاں ختم ہو جاتا اور آگے کی ساری ذمہ داریاں مخاطبین پر عائد ہو جاتیں۔ لیکن واقعہ یوں ہے نہیں۔ نبی کے فتنے کام اور بھی ہے۔ وہ ہے تعلیم کتاب !

تعلیم کتاب | یہ تعلیم کتاب کیا چیز ہوئی جب نبی سلم نے خدا کی آیات کو جوں کا توں پڑھ دیا اور لوگوں کی اپنی زبان میں، بڑی سادہ زبان میں، بڑی فصیح زبان میں، بڑے دلنشین انداز کے ساتھ پیغامِ الہی کو بندوں کے پردہ ہائے سماعت تک پہنچا دیا تو کیا تعلیم کتاب اس کے علاوہ کچھ اور ہوتی ہے؟ اگر تعلیم کتاب بس یہی ہے تو دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "تلاوت آیات" اور "تعلیم کتاب" کیا ہم معنی کلمات ہیں؟ ایسا ہے تو نحواً باللہ اللہ تعالیٰ سے اس امر قب القاط کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ پھر، یقیناً اگر یہ خدا کا کلام ہے تو تلاوت آیات اور تعلیم کتاب میں فرق ہونا چاہیے۔ اسی فرق ہے، بہت بڑا فرق ہے !

تعلیم محض القاط اور جملوں کی قرأت و تلاوت کو نہیں کہتے معلم کا کام صرف یہ نہیں ہوتا کہ وہ آواز کی کچھ لہریں پیدا کر دے اور بس وہ لہریں متعلمین کے پردہ ہائے سماعت سے ٹکرا جائیں تو اس کا کام ختم ہو گیا۔ تعلیم اس کو کہتے ہیں کہ جس حقیقت کا مفہم مطلوب ہے معلم اس کے بارے میں شکوک و شبہات کو صاف کر کے، اس کے متعلق سامنے آنے والے سوالات اور تشکالات کو حل کر کے، مخاطبین کی ذہنی سطح

کے اختلافات کے پیش نظر اس کو مختلف اسالیب سے قابل قبول بنا کر دلوں میں اتار دینے کی تمام ضرورتیں اور کوششیں لائے۔ وہ جس امر کے بارے میں چاہتا ہے کہ لوگوں کے اندر اس کے صحیح ہونے کا، اور جس امر کے بارے میں چاہتا ہے کہ لوگوں میں اس کے غلط ہونے کا علم اور شعور پیدا ہو۔ اس کے بارے میں اس کا نام اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ اسے صحیح یا غلط کہہ دے، بلکہ تعلیم کے سلمے ہی اتنا ہے کہ اسے کتنا اس پر لازم ہے وہ ایک شے کو اگر اس حیثیت سے لوگوں کے علم میں لانا چاہتا ہے کہ اس شے کو لازماً معمول بنا یا جائے۔

تو اس کے لیے اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ وہ اس کو بیان کر دے، بلکہ ضروری یہ بھی ہے کہ اگر لوگ اس کو عمل میں لانے کے طریقے یا اس کی صورت کے بارے میں کسی تصریح اور کسی تفصیل کے محتاج ہوں تو وہ

تصریح اور تفصیل بھی کر دے۔ ایک عام وسیع حکم پیش کرنے کے بعد معلم اس کا ذمہ دار بھی ہے کہ متعین جزئی صورتوں کے بارے میں اگر اس کے شاگرد واضح راہنمائی کے محتاج ہوں تو وہ ان کو رہنمائی دے۔ اسی طرح اگر کسی خاص جزئی حکم سے عام معاملات کے لیے کسی نتیجہ کے نکلنے کا امکان ہو اور یہ امکان سوالات کو ابھار لائے تو معلم کا فرض ہے کہ وہ اس کے اندر کے مضمحلہ کو کھول کر رکھ دے۔

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ تلاوت آیات کے مقابلے میں تعلیم کتاب کا فرض زیادہ وسیع ہے اور اس کی حدود بڑی دور رس ہیں۔ واضح رہے کہ کوئی کتاب کتنی ہی شرح و بسط سے لکھ دی جائے وہ اپنی تعلیم کے لیے خود معلم نہیں بن سکتی۔ اسی لیے ہر دور میں اللہ تعالیٰ نے "الکتاب" کے ساتھ ساتھ "الرسول" کو مبعوث کیا ہے۔ ایک طرف تلاوت آیات کے ذریعے خدا کے انبیاء و رسل خدا کا پیغام جوں کا توں بندوں تک پہنچاتے ہیں، اور دوسری طرف وہ اس پیغام کے ذہنوں میں اتارنے اور عملی زندگی کی روح بنانے کے لیے مسندِ معلیٰ پر بیٹھتے ہیں۔ اس مسندِ معلیٰ پر بیٹھ کر وہ خدا کے پیغام کے الفاظ اور جملوں ہی کو دوہراتے نہیں دہرتے، بلکہ وہ اپنی زبان سے بھی بہت کچھ کہتے ہیں۔ یہ جو کچھ کہ انبیاءِ معلیٰ کی مسند سے کلام کرتے ہیں، یہ آخر کیا مقام رکھتا ہے؟ محض ذاتی خیالات کہ جو اس کے اپنے زمانے کی ہو، اس میں اس کے رہ جائیں، یا ان کی کوئی شرعی و دینی اہمیت ہے؟ اگر ان کی شرعی و دینی اہمیت نہیں ہے تو پھر یہ لازماً بعض الماقادیل کی تعریف میں داخل ہونگے، لیکن اس طرح کی بات صرف جہلاء ہی سوچ سکتے ہیں۔ قرآن تو واضح کر رہا ہے کہ نبی کو معلیٰ کی مسند پر بٹھانے والا خود وہ اللہ ہے جس نے کتاب بھیجی اور تلاوت آیات کا فرض نبی کے سر عائد کیا۔ پس نبی معلیٰ کی مسند سے جو کچھ کہے گا وہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی رضا کے عین مطابق ہوگا، اور اس کی دینی و شرعی اہمیت مانتی رہے گی۔

دیکھیے تعلیم کتاب کی چند مثالیں سامنے رکھ لیجیے۔

آیت کسرت نازل ہوتی ہے۔ نبی تلاوت کرتا ہے: الَّذِينَ يَكْفُرُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ... الخ

بڑے سادہ سے الفاظ ہیں، اور کوئی وجہ نہ تھی کہ ان کو لوگ سمجھ نہ جاتے۔ انہوں نے اسے یوں سمجھا کہ سونا چاندی جس کے پاس جمع ہو، وہ مجرم ہے، اور اگر وہ اس کو تمام تر اللہ تعالیٰ کی راہ میں صرف نہ کر دے

تو آخرت میں وہ اس عذاب سے دوچار ہوگا کہ اسکے پہلو اور اس کی پیٹھ اتنی ٹکلیوں سے تپتا تھا کہ داغی جا سکی۔ جن کو اس نے سینت سینت کر رکھا تھا۔ ظاہر بات ہے کہ بے شمار لوگ ہونگے جن کے قبضے میں درہم دینا، سونے چاندی کے زیورات وغیرہ ہونگے۔ اس آیت کا فوری اثر کیا پڑتا چاہیے؟ یہی کہ لوگوں کے سامنے یہ دریا آجائے کہ کنز ہوگا تو رطلے الہی حاصل نہیں ہوگی اور رطلے الہی مطلوب ہونے لگتا تو خدا کے نام پر ضرر کر دینا لازم ہے۔ اور نتیجہ ایک عام گھبراہٹ پھیلنی چاہیے تھی۔ پھر اس گھبراہٹ کو ایک سوال میں ڈھل جانا چاہیے تھا یعنی کیا کوئی شخص سونا چاندی اپنے قبضے میں رکھتے ہوئے مومن و مسلم رہ سکتا ہے؟ خدا تعالیٰ کا صالح بندہ شمار ہو سکتا ہے؟ آخرت میں نجات پاسکتا ہے؟

یہی ہونا چاہیے تھا یا کچھ اور؟

حدیث بتاتی ہے کہ یہی ہوا۔ یہ گھبراہٹ بھی پیدا ہوئی، یہ سوال بھی اُٹھا۔ اور آخر کار یہ سوال نبی صلعم کے سامنے لا رکھا گیا تاکہ اب وہ تلاوت آیات کرنے والی ہستی تعلیم کتاب کا فرض بھی انجام دے اور اس معلم مامورین اللہ نے اپنی مسندِ معلّمی پر بیٹھ کر یہ تصریح کی کہ اس آیت میں کنز سے مراد وہ اندونختہ ہے جس میں سے حق اللہ (یعنی زکوٰۃ) ادا نہ ہو۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ آدمی کا محض سونا چاندی پاس رکھنا جرم قرار دے دیا گیا ہے۔ اس جواب سے اطمینان پیدا ہونا چاہیے تھا۔ اور حدیث گواہی دیتی ہے کہ یہ اطمینان بھی پیدا ہوا۔ پھر اس جواب کے بعد کوئی وجہ نہ تھی کہ لوگ زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد اپنے اپنے املاک و اموال سے استقارہ کرنا ترک کر دیتے۔ چنانچہ اس سوسائٹی کا ریکارڈ بتاتا ہے کہ اس میں ایسے زکوٰۃ کا لاپرواہی طرح اہتمام تھا لیکن سونا چاندی املاک میں داخل ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے بچے ہوئے اموال خرچ کر کے دامن جھاڑ کر کھڑا نہیں ہو گیا۔

اب فرمائیے کہ اس آیت سے جو سوال پیدا ہوا تھا اس کا جواب خود کتاب بھی کیوں نہ دے لیا؟ جیکہ آپ اسے ہر لحاظ سے دینی ضروریات کے لیے کافی قرار دیتے ہیں؛ اور جو جواب نبی نے معلّمی کی مسند پر بیٹھ کر دیا، کیا آپ ثابت کر سکتے ہیں کہ جواب کچھ اور دیا گیا تھا، یہ نہیں تھا؛ اور اگر ایسا ثابت کرنا ممکن نہیں ہے تو ارشاد ہو کہ اس جواب کی حیثیت کیا ہے؟ کیا ایک عامی کی طرح محض ذاتی رائے کی؟ کیا

ایک وقتی فیصلے کی ؟

جی نہیں! یہ جواب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس منصب سے دیا ہے جو خود اُس کتاب ہی نے آپ کے بارے میں قرار دیا ہے جس کتاب کو آپ پہنچانے آئے تھے! اس کی اہمیت پروری کی پوری شرعی و دینی ہے۔ اب ایک اور مثال لیجیے۔ قرآن نے مومنین کا جہاں کہیں کوئی نقشہ پیش کیا ہے اور ایمان کا جو تصور دلایا ہے، نیز دوسری طرف گناہ اور معصیت، خصوصاً کباہر کی جو کالی تصویر کھینچی ہے، اُس نے نبی صلعم کی زیر تربیت جماعت پر بڑا اثر ڈالا۔ چنانچہ جماعت میں آہستہ آہستہ ایک تشویش یہ پیدا ہونے لگی کہ آیا کباہر کی مغفرت بھی ہو سکتی ہے؟ آپ کہیں گے کہ کیوں نہیں، قرآن نے تو ساف الفاظ میں آدمی کے لیے توبہ و اصلاح کے دروازے کھولے ہیں۔ لیکن وہاں یہ تشویش ایمان اور معصیت کی منافات کی گہری حس کی وجہ سے ہوئی تھی۔ وہاں سوال یہ تھا کہ آدمی نے کفر و منکرات سے توبہ کی، خدا پر ایمان لایا، نبی کی اطاعت کو قبول کیا۔ ایک ضابطہ سچے دل سے اپنے لیے مانا، آخرت کی عدالت میں جو ابدی کا احساس اپنے اندر ابھارا، تو کیا اس کیفیت ایمان کے ساتھ، اس شعوری حالت کے ہوتے ہوئے یہ ممکن بھی ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے صریح احکام کے خلاف اُس کی نافرمانی کر گزرے۔ وہ اگر صریح نافرمانی کرتا ہے تو گویا اس کے ایمان کا معاملہ مشکوک ہے، اور ایمان زندہ ہے تو کم سے کم کباہر معصیت کا صدور قابل فہم نہیں ہے۔ یہ تشویش معمولی اور عامی لوگوں میں نہیں، بلکہ اونچے درجے کے متقی صحابہ، اور آنحضرت صلعم کی خاص تربیت میں بہنے والے صحابہ کے اندر ایک دور میں عام رہی ہے۔ چنانچہ یہ سوالات کی شکل میں ڈھل گئی۔ یہ سوالات اپنی اصلی صورت میں اگرچہ ہمیں ریکارڈ میں نہیں ملتے لیکن احادیث میں ان کے جو جواب دیئے گئے ہیں وہ خود ان کو سامنے لے آتے ہیں اور احادیث ہی کے ذریعے تشویش کی وہ فضا بھی نکلا ہوں میں آجاتی ہے جس میں نبی صلعم نے بار بار تصریحات کی ہیں۔

ان سوالات کے جواب میں اس تشویش کا ازالہ کرنے کے لیے کئی مجالس میں، کئی مواقع پر، مختلف صحابہ کو خطاب کرتے ہوئے آپ نے اصل حقیقت کو نتھار کر پیش فرمایا ہے۔ خصوصیت سے روایت ابی ذر تو ایسی بجا بہت سے اُس تشویش اور سوال کی شکل و صورت کو سامنے لے آتی ہے کہ لفظی ریکارڈ کی کوئی

حضرت باقی نہیں رہتی۔

حضرت ابو ذرؓ کی رپورٹ ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور جاتے ہیں، اور آپ کو سفید چادر تانے جو استراحت دیکھتے ہیں۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد جاتے ہیں (یعنی کوئی خاص پریشان کن امر آپ کے سامنے ہے) اور اتنے میں آنحضرتؐ بیدار ہو چکے ہیں۔ حضرت ابو ذرؓ یہاں سے اپنی گفتگو کو ساقط کر کے، معاً آنحضرتؐ کا قول نقل کر دیتے ہیں۔

آنحضرتؐ نے فرمایا:-

”کوئی بندہ ایسا نہیں ہے کہ وہ کہے کہ ایک اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے، پھر اسی کے اوپر قائم

رہنے کی حالت میں مر جائے تو وہ جنت میں نہ جا پہنچے!

یہ سن کر حضرت ابو ذرؓ (اپنی اسی تشویش کی وجہ سے) اضطراب کے ساتھ پوچھتے ہیں:-

”اگرچہ اُس نے زنا کی ہو؟ اگرچہ اُس نے چوری کی ہو؟

اور آنحضرتؐ فرماتے ہیں:-

”ہاں! اگرچہ اُس نے زنا کی ہو! اگرچہ اُس نے چوری کی ہو!

حضرت ابو ذرؓ کو جیسے اپنے کانوں پر اعتماد نہ ہو رہا ہو (اور یہ اسی تشویش کی وجہ سے) پھر زور سے

کر پوچھتے ہیں:-

”اگرچہ اُس نے زنا کی ہو؟ اگرچہ اُس نے چوری کی ہو؟

اور آنحضرتؐ ان کی تشویش کے زلے کے لیے پھر فرماتے ہیں کہ:-

”جی ہاں! اگرچہ اُس نے زنا کی ہو! اگرچہ اُس نے چوری کی ہو؟

اور حضرت ابو ذرؓ کو پھر حیرت ہوتی ہے کہ آنحضرتؐ یہ کیا فرما رہے ہیں، وہ پھر فریاد زور سے کر پوچھتے ہیں:-

”چاہے اُس نے زنا کی ہو؟ چاہے اُس نے چوری کی ہو؟

اور غیبی مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جواب کو حرف آخر بنا کر لبوں کو جنبش دیتے ہیں کہ:-

”ہاں، ہاں! چاہے اُس نے زنا کی ہو! چاہے اُس نے چوری کی ہو۔۔۔ (وہ جنت میں جا پہنچے گا)

اور ابو ذر کے (اس اضطراب کے) علی الرغم جا پہنچے گا؟

فراخیال رہے کہ اس موقع پر سائل حضرت ابو ذرؓ میں۔ دوسرے مواقع پر نبی صلعم کا یہی خطاب معاذ سے ہے کہیں حضرت عمرؓ سے، اور گونا گوں اطوار کے ساتھ یہ مضمون سامنے آتا ہے، اور کثرت روایات بتاتی ہے کہ یہ تشویش کئی صحابہ میں رہی اور کچھ مدت تک رہی، اور یہ وقت ذہن صاف ہوئے۔ بہر حال یہ سائل ایسے لوگ تو نہ تھے جو خاکم بدہن گناہ کے لیے چور دروازے کھلوانے کے درپے ہوئے ہوں۔ بلکہ گناہ سے بچنے میں اور گناہ سے نفرت کرنے میں پوری سوسائٹی میں پیش پیش تھے۔ ان کی نگاہ میں تو گناہ اتنی خطرناک چیز بن چلا تھا کہ اسے یہ ایمان کے قطعی منافی بلکہ اس کی جڑ کاٹ دینے والا سمجھتے تھے۔ ان کا معاملہ گناہ کے لیے دروازے کھلوانے کا نہیں تھا بلکہ اس سلسلے کی جلد روایات سے مستفاد ہوتا ہے کہ، اثنان کی الجھن یہ تھی کہ جس آدمی سے کبیرہ کا ارتکاب ہوتا ہے تو یہ ارتکاب حالت ایمان کی نفی ہے۔ پھر ایسے آدمی کے لیے نجات کہاں!

اسی الجھن کو صاف کرنے کے لیے دوسری آیات میں نبی صلعم نے یہ توضیح فرمائی کہ یہ ٹھیک ہے کہ ایمان اور معصیت باہم منافات رکھتے ہیں، اور یہ واقعہ ہے کہ جب آدمی چوبی کرتا ہے، زنا کرتا ہے، جھوٹ بولتا ہے تو اس کا ایمان اُس سے الگ ہو جاتا ہے لیکن گناہ کے غلبے سے نکلتے ہی اگر وہ پشیمان ہو کر اپنے آپ کو سنبھالتا ہے اور اپنی اصلاح کرتا ہے، تو حالت ایمان اس کی طرف لوٹ آتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اثنان کمزوریاں نے نرغے میں آکر اگر کبھی پھسل جاتا ہے تو گناہ ہمیشہ کے لیے اُس پر چپک کر نہیں رہ جاتا، بشرطیکہ وہ اس کی گندگی کو اپنے آپ سے دور کرنے کے لیے بے چین ہو۔ اب آئیے اور چند باتوں پر غور فرمائیے :-

پہلی یہ کہ قرآن جب اپنا شارح ہونے کے لیے آپ کافی تھا، بہر لحاظ سے مفصل تھا، سادہ و فصیح زبان میں تھا اور حضرت معاذ، حضرت ابو ذرؓ اور حضرت عمرؓ جیسے اکابر صحابہ اسے سنتے رہے، مسلسل سنتے رہے، اس پر غور و تدبر سے کام لیتے رہے، نیک نیتی کے ساتھ اس کے لفظ لفظ پر عمل کرنے کے لیے کوشاں رہے، تو کیوں ایسا ہوا کہ وہ اس طرح کے اشکال اور اس طرح کی تشویش میں مبتلا ہوئے؟

دوسری یہ کہ قرآن کو سمجھنے کے لیے وہ پھر قرآن ہی کی طرف رجوع کرنے کے بجائے آنحضرت صلعم کے سامنے کیوں اپنے اشکال اور اپنے سوال سے لے لے کے حاضر ہوتے، جبکہ ایک گروہ کے نزدیک قرآن کے الفاظ کو پہنچا دینے سے زیادہ آنحضرت کا کوئی منصب تھا ہی نہیں؟

تیسری یہ کہ آنحضرت اگر محض قاصد ہوتے تو آپ کو حق ہی کیا پہنچتا تھا کہ الفاظ قرآن کے علاوہ کوئی بات اپنی طرف سے تشریح و توضیح کے لیے فرماتے؟

واقعہ یہ ہے کہ صحابہ میں سوالات کا پیدا ہونا بھی فطری تھا، اور ان کا نبی صلعم کی طرف اشکال رفع کرنے کے لیے رجوع کرنا بھی برحق تھا، اور نبی صلعم کا اپنی زبان سے ان کے ذہنی حالات کے پیش نظر قرآن کے مدعا کو واضح کرنا بھی عین منصب نبوت کا تقاضا تھا۔ آپ معلمی کی مسند سے اپنے ارشادات نشر کر رہے تھے، پوری تحدی سے کہ رہے تھے اور ان لوگوں کے علی الرغم کر رہے تھے جو کہتے ہیں کہ ہیں نبی کی تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔

کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر نبی صلعم نے قرآن کے مدعا کی ایک خاص تشریح کی تھی تو وہ ایک ذاتی فعل تھا اور اپنے وقت میں مناسب تھا، اب جو مگر پورا چاہے اٹھے اور کوئی دوسری من مانی تشریح کرنے، بھی اپنے وقت میں وہی حیثیت رکھے گی جو ایک وقت میں محمد صلعم کی تشریح کی تھی! جی نہیں! محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے تعلیم کتاب کی ایک خاص ڈیوٹی پر مامور تھے، اپنی امت کو کتاب اللہ کے الفاظ پہنچا دینے کے ساتھ ساتھ آپ کا فریضہ یہ بھی تھا کہ علم کتاب بھی پہنچانے کے جائیں۔ لہذا آنحضرت کی تعلیم کتاب اور کسی دوسرے کی تفسیر و تاویل ہم تہ نہیں ہیں! چونکہ حاکم را یا عالم پاک! رسول اللہ جو کچھ فرمائے وہ حریف آخر ہے، اس کے پیچھے ایک اتھاڑی ہے، وہ ایک منصب کے تحت ہے۔

مادعا جو کچھ کہتے ہیں وہ ذاتی مطالعہ و علم کا حاصل ہے، اور اس کی کوئی شرعی و دینی اہمیت نہیں!

تعلیم حکمت | کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کتاب سکھانا اور حکمت سکھانا دونوں باتیں ایک تھیں، خواہ مخواہ محض حسن کلام کے لیے تکرار سے کام لیا گیا۔ نبی کے ذریعے جس حکمت کو کسی امت تک پہنچایا جانا ہوتا ہے، وہ پہلے تمام مکالمات خود نبی کو دی جاتی ہے۔ حکمت جو نبی کو دی جاتی ہے وہ ایک روشن چراغ ہوتی ہے۔

کہ جس کی نو سے اس کے پیرو اپنے اپنے چراغ روشن کیے جاتے ہیں۔ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ نبی کی حکمت ایک آفتاب ہوتی ہے جس سے آسمانِ انسانیت کے کونے اپنی اپنی مقدرت اور اپنے اپنے قرب و بعد کے لحاظ سے اکتساب نور کرتے ہیں اور پھر خود نور پائش بن جاتے ہیں۔ اسی مناسبت سے آنحضرتؐ نے اپنے رفقاء دین کو تاروں سے تشبیہ دی تھی کہ ان جھلملاتے تاروں میں سے جس کی کونوں کو بھی لوگے اور جس سے بھی مسلکِ زندگی کی سمت معلوم کر گئے، ہدایت پاؤ گے۔ کیونکہ ان کی کونیں خود فیضانِ رسالت ہیں؛ نبی کی پوزیشن اگر قائد کی ہوتی تو عظیمہ حکمت سے ان کو نوازے جانے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ انبیاء و رسل کا حکمت سے نوازا جانا خود اس بات پر گواہ ہے کہ نبی اللہ تعالیٰ کا اختیار یا قہ تمائندہ اور اس کا خلیفہ اور اس کا معتمد علیہ سفیر ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے منصب کے مطابق اقامتِ دین کا پورا کام کرتا ہے۔

حکمت کہتے کسے ہیں؟

لغت کی طرف جائیے تو وہ اس کا مفہوم واضح کرنے کے لیے "العقل، العلو، الحلو، الحلو، البقو" کے الفاظ سے کام لیتا ہے۔ عدل کا مطلب یہ ہے کہ ہر شے ٹھیک اپنی جگہ پر رکھی جائے، ہر ایک کو اس کا صحیح مقام دیا جائے، جو چیز جس وزن کی مستحق ہو وہی وزن اس کو دیا جائے، ترانہ ہاتھ میں لے کر اس کے پڑے برابر کر دیئے جائیں، جس کا جوتی ہو وہ اس کو پورے کا پورا دیا جائے اور جس پر جو واجب آتا ہو وہ اس سے پورے کا پورا لے لیا جائے۔ اور جب "عدل" کو "ال" کے ساتھ زور دے کر خاص اصطلاح دینی میں بولا جائے تو مفہوم ہو گا زندگی کے معاملات کو صحیح عقائد و نظریات پر بالکل توازن سے استوار کرنا، افراط و تفریط کے درمیان اعتدال کی راہ پر گامزن ہونا، حرام کو حرام کی جگہ اور حلال کو حلال کی جگہ رکھنا، زیادہ اہم کو زیادہ اہم اور کم اہم کو کم اہم سمجھنا، جو جس کے حقوق ہیں وہی اس کے حقوق قرار دینا، نہ ان کو گھٹانا، نہ بڑھانا، اہم کا مطلب یہ ہے کہ جاننے کی چیز کو جانا جائے، اور کما حقہ جانا جائے، ظاہر کے ساتھ ساتھ باطن کو جانا جائے، غرض اور مصلحت اور مقصد کو جانا جائے، اجمال کے اندر جو تفصیل مستتر ہے اسے جانا جائے اور اشارات سے مشا راہیہ کو معلوم کیا جائے۔ اور جب یہ خاص دینی اصطلاح بن جائے تو اس کا مدعا یہ ہو گا کہ ان

بنیادی حقیقتوں پر عبور حاصل کیا جائے جن پر کائنات اور انسانی زندگی کی بنیاد قائم ہے، جو منہگام نہ وجود کی رُوح رواں بن کر کام کر رہی ہیں، خدا کے احکام اور ان کے منشاء و منطوق کو جانا جائے، خیر اور شر اور حلال اور حرام میں فرق کرنے والے اخلاقی وجوہ و اسباب کو معلوم کیا جائے۔ اور علم سے مراد جذبات کے توازن کی حالت ہے جو ”جہالت“ (عربی مفہوم کے ساتھ) کی عین ضد ہے۔ نہ کوئی فطری جذبہ اپنی حد سے بڑھنے پائے اور نہ کوئی فطری جذبہ اپنی حد سے کمزور ہونے پائے، بلکہ سارے کے سارے جذبات اپنی اپنی جگہ حالت اعتدال پر کام کریں، کوئی کسی دوسرے کو دبا لے جانے والا نہ ہو۔ نیز علم اس حالت کا نام ہے کہ جذبے اور عقل کے درمیان بھی ٹھیک ٹھیک تناسب موجود ہو۔ وہ اپنا وظیفہ فطری حدود میں انجام دے، یہ اپنا فریضہ اپنی فطری حدود میں صحیح طریقے سے پورا کرے۔ ذہن اور روح اور قلب کو اس حالت توازن پر قائم رکھنے کا نام حکمت ہوا۔ اور نبوت سے یہاں مراد محض عہدہ نبوت نہیں، کار نبوت ہے یعنی ایک نبی اپنے پھیلے ہوئے گونا گوں فرائض کو ادا کرنے کے لیے جس خاص فہم و بصیرت، جس خاص عدل اور جس خاص علم سے اور جس خاص تکنیک اور اسلوب پر قدم قدم کے مختلف حالات اور زندگی کے مختلف تہوں میں کام لیتا ہے۔ وہ حکمت سے موسوم ہے، کار نبوت حکمت کے خیر ممکن ہی نہیں!

خدا نے خود اپنے کو صاحب حکمت بتایا ہے۔ اس کے ناموں میں سے ایک نام ہی حکیم ہے اور یہ نام قرآن میں بے شمار مرتبہ دوہرایا گیا ہے۔ قرآن میں خدا کی یہ صفت جہاں بھی بیان ہوئی ہے یہ واضح کرنے کے لیے بیان ہوئی ہے کہ کاخانہ کائنات کے بنانے میں انسان کو پیدا کرنے میں، زندگی کے قوانین مقرر کرنے میں، شرائع کے نافذ کرنے میں، ایک سوچا سمجھا منصوبہ کام کر رہا ہے، ایک مقصدیت ہے جو کئی کئی ہر ہر میں مضمر ہے۔ ایک توازن و اعتدال ہے جو ذرے کی بندش سے لے کر نظام شمسی تک، ہر طرف نمودار ہے۔ وہ جو کچھ کر رہا ہے اندھا دھند نہیں کر رہا ہے، بلکہ اس کے زیر حکم جو بناؤ اور جو بگاڑ واقع ہوتا ہے، جس گوشے میں تخریب اور جس گوشے میں تعمیر ہوتی ہے، ایسے قوانین و ضوابط کے تحت ہوتی ہے جن کی بنیاد بڑی بھاری مصلحتوں پر رکھی گئی ہے۔

اسی حکمت کا پر تو ہے جو اللہ تعالیٰ عقائد و احکام اور اخلاق و آداب شرعیہ کے معاملے میں اور نظام حق کے بارے میں اپنے انبیاء پر ڈالتا ہے اور پھر اس کا عکس مومنین صالحین پر پڑتا ہے۔ نبی علم، عدل اور حلم کے کمالات سے متصف ہو کر کتاب الہی کی مسطور کے بین المسطور کو جب پڑھتا ہے تو وہ اس توازن کا راز داں بن جاتا ہے جو اسلامی زندگی اور اسلامی معاشرے کا لازمہ ہے۔ وہ فکر و عمل کی نیاد میں عدل کے پھیلے ہوئے تقاضوں کو سمجھ لیتا ہے، وہ اصول و احکام کی ترتیب مدارج کا شعور حاصل کر لیتا ہے، وہ اشاروں اشاروں سے منشاء الہی کو اخذ کر لیتا ہے، وہ حلت و حرمت کے اخلاقی موجبات کو پاتا لیتا ہے، اس کی نگاہ انفعال مطلوب اور انفعال مردود کے بعید مقاصد کو پالیتی ہے، وہ الفاظ کو عمل کا جامہ پہنانے کے بہترین اسلوب پر دسترس حاصل کر لیتا ہے، اور پھر وہ کسی منشاء الہی کو رذہ مرہ کی زندگی کے مختلف احوال اور انسانی کرداروں کے گونا گوں مظاہر کے درمیان نافذ کرنے کے بہترین پیرائے جان جاتا ہے یہ ہوتی ہے حکمت جسے نبی تبلیغ کے کام میں بھی، جماعت کی تنظیم کے کام میں بھی، تعلیم و ترقی کے کام میں بھی، تحریک کو آگے بڑھانے کے کام میں بھی اور ایک ریاست چلانے کے کام میں بھی اللہ تعالیٰ کی زیر نگرانی و ہدایت استعمال کرتا ہے، اور جس کی تعلیم وہ اپنے سارے ہی پیروں کو دیتا ہے، نیز جس سے وہ غیر معمولی خلوص و ذہانت رکھنے والے خاص خاص زقائد کو اس حد تک آراستہ کرنے میں ساری عمر لگا دیتا ہے کہ وہ اس کے بعد اسی حکمت کے معلم بن سکیں۔

دینی اصطلاح میں یہ حکمت اتنا بلند مقام رکھتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے خیر کثیر قرار دیا ہے۔

آج کل کے جہلاء نے اس اصطلاح کو اس کے اس مفہوم سے آنا گرایا ہے کہ ہر خرافی فلسفے پر او ہر سائنس پر اور ہر تعلیم پر جو مغرب کی طرف سے وی جا رہی ہو بلا تکلف اس کو چپکا دیا جاتا ہے لیکن قرآن نے اس کو ایسے گھٹیا معنوں میں استعمال نہیں کیا ہے۔ قرآن اس حکمت کا ذکر کر رہا ہے جو انبیاء کو دی گئی اور جس کی تعلیم دینے پر ان کو مامور کیا گیا!

یہ حکمت ایسی چیز نہیں ہے جسے چند ابواب اور فصول کے تحت کسی کتاب میں سمیٹ کر دنیا کے حوالے کر دیا جائے۔ آخر کیا آپ یہ مان سکتے ہیں کہ عام و نیروی سو جھ بوجھ ایسی چیز ہے جسے کسی انسائیکلو پیڈیا

میں بھر کر ہر آدمی کو پڑھا دیا جاسکے؟ کیا سوچنے، رائے قائم کرنے، توازن ذہنی سے کام لینے، بھلے برے کی پرکھ کرنے کی صلاحیت کوئی ایسی جنس ہے کہ کونین کے پاؤڈر یا پینفٹے کے پھولوں کی طرح اس کی پڑیاں بنا کر ضرورت مندوں کو دے دی جائیں کہ اس کی اتنی خوراکیں کھا لینا تو تم ایک دانش ور آدمی ہو جاؤ گے؟ ہرگز نہیں! — تو کیا دینی اصطلاح میں جس چیز کو حکمت کا نام دیا گیا ہے وہ ایسی ہو سکتی ہے کہ ایک کتاب لوگوں کے ہاتھ میں دے کر کہا جائے کہ جاؤ اب تم حکیم بن جاؤ گے؟ یہ کوئی عقل میں آنے والی بات ہے؟

حکمت تربیت سے پیدا ہوتی ہے، اور اگر بات تصوف کے میدان میں نہ جاؤ الی جاٹے تو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ فیضانِ نظر سے اس کی آبیاری ہوتی ہے۔

انفرادی مذہب داری کے لیے فقہ کے ضابطے ممکن ہے کہ کافی ہو جائیں اور گئے چنے اور نوواہی کی ایک فہرست سامنے رکھ لینا آدمی کے لیے بس کرتا ہو، لیکن ایک اجتماعی دین، ایک تحریک اور ایک نظام فقط ضوابط اور احکام کی فہرستوں کے بل پر نہیں چلتا، اس کے لیے ناگزیر ہوتا ہے کہ اس کے علمبرداروں میں حکمت کا زفرہ ہو۔ یہی کام ہے جو تعلیم کتاب کے ساتھ نبی کرتا ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ قرآن کے اندر سر سے حکمت کی تعلیم موجود نہیں ہے۔ یقیناً ہے۔ حکمت دینی جن اصولوں پر مبنی ہے ان کو قرآن نے جاہر جا بیان کیا ہے اور بعض مقامات پر اس حکمت کے تقاضوں کی طرف اشارات کر دیے ہیں۔ لیکن بہر حال ایسا ممکن نہیں ہے کہ حکمت پر کوئی مضمون شائع کر کے کام چلایا جاسکے۔ حکمت کی تربیت کے لیے کتاب کے ساتھ رسول کا ہونا بڑا ہی ضروری تھا۔ کیونکہ کتاب تو حکمت کی طرف اشارے کر سکتی ہے۔ عملی تربیت تو ایک مرتبی ہی دیا کرتا ہے۔

آئیے تعلیمِ حکمت کی چند مثالوں پر بھی نگاہ ڈالیں۔

۱، ابی امامہ کی رپورٹ ہے۔ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ ما الایمان؟ ایمان کس حالت کا نام ہے؟ رظا ہر بات ہے کہ نبی صلعم کی دعوت پر اس طرح کے سوالات کا پیدا ہونا فطری امر تھا۔

اس کے جواب میں نبی صلعم دوسری روایات کی طرح یہ جواب نہیں دیتے کہ خدا، انبیاء، کتب، فرشتوں اور آخرت کے ہونے پر یقین رکھنے کا نام ایمان ہے، بلکہ سائل کے خاص منشاء کو سمجھ کر کیفیتِ ایمان کو واضح فرماتے ہیں:-

”جب نیکی تجھے فرحت دے اور برائی تجھے دکھ پہنچائے تو تو ایمان کی حالت میں ہے!“

پھر اُس نے پوچھا:- اے اللہ کے رسول! گناہ کی کیفیت کیا ہے؟

نبی صلعم نے جواب دیا:- ”یہ کہ کوئی چیز تیرے ذہن میں کھٹکے!“

دیکھیے یہاں بھی آپ نے گناہوں کی فہرست نہیں ستادی، بلکہ سائل کا منشاء سمجھ کر حکیمانہ طریق سے

اس پر گناہ کی کیفیتِ نفسی کو واضح کیا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ پوچھنے والا مسلم ہے، ایمان رکھتا ہے، حق

و باطل کو جانتا ہے، مظلومیات اور ممنوعات اس کے سامنے ہیں، وہ مسلم سماج کے ایسے ماحول میں رہتا

ہے جس میں رشد و غی مبہم و مرکب نہیں ہیں، بلکہ تمیز ہو چکے ہیں اور جس میں انسانی فطرت آلائشوں سے

پاک ہو کر نکھرائی ہے، اس لیے سائل کو آپ نے اس کے حالات کے مطابق حالتِ ایمان اور کیفیت

گناہ کا ایک نفسیاتی پیمانہ دے دیا۔

یہ پیمانہ اس متعین سادہ شکل میں قرآن میں کہاں پیش کیا گیا ہے؟

لیکن یہ پیمانہ قرآن سے متعارض کہاں ہے؟

قرآن کے موافق ہے تو کیا نبی نے محض ذاتی رائے سے یہ ایک فلسفہ (نعوذ باللہ) گھڑ ڈالا، یا

عین منشاءِ الہی کو واضح کیا۔

کیا ایمان و گناہ کی اس تعبیر کو رد کر کے کوئی شخص اگر کوئی دوسری تعبیر اس سے متضاد اختیار کرے

تو وہ ایمان بالرسالت پر قائم رہ جائے گا؟ — ہرگز نہیں! اُس نے نبی صلعم کی حکمت اور تعلیمِ حکمت

کو رد کر دیا جو آپ باضابطہ سرکاری حیثیت سے دے رہے تھے۔

(۲) قرآن میں اسلام کے مخالفین و اُجانب سے ”توٹی“ کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ نظا ہر بلت

ہے کہ جو لوگ اسلام کے فلسفہ و اصول اور ضابطہ و مسلک کے مخالف ہوں، جن کی دن رات کی

سرگرمیاں اس کی مخالفت کے لیے وقف ہوں، جو اس کی قوت کو توڑنے کے درپے ہوں ان سے کسی مسلمان کا قلبی میلان ہونا، ان میں محبت آمیز طریق سے خلا ملنا، ان سے مشورہ و رازداری کا تعلق ان پر اعتماد اور بھروسہ حمیت و غیرت کے بھی خلاف ہے اور نتائج کے لحاظ سے بھی اسلامی معاشرے کے لیے ہبک ہے۔

قرآن نے دشمنانِ حق سے توٹی کو حرام قرار دیا تھا۔ لیکن نبی بہ حیثیت معلم حکمت "تشبیہ" کو بھی ممنوع ٹھہراتا ہے۔ کیا تعلیم حکمت قرآن کے خلاف ہے؟ کیا یہ اضافہ ہے قرآن کی تعلیم پر؟ یا درحقیقت یہ حرمت توٹی کا عین تقاضا ہے کہ تشبیہ بھی حرام ہو؟ اگر حقیقت یہی ہے تو حرمت توٹی سے حرمت تشبیہ نبی کے سوا اور کون اخذ کر سکتا تھا؟ اور کہ بھی لیتا تو اس کو سند اعتبار کیسے حاصل ہوتی؟

نبی و رسول کی نگاہِ دور رس، جو اللہ تعالیٰ کی چشمِ کرم کے فیضانِ نگاہ سے تربیت پاتی ہے، صاف صاف دیکھتی ہے کہ تشبیہ یا تو علامت ہے توٹی کی یا غیرت و حمیت اصول و مسلک کے اس فقدان کی جو بالآخر توٹی ہی پر منتج ہو سکتا ہے۔ ظاہرات ہے کہ ایک مسلمان اگر رہن بہن، طور طریقوں اور وضع قطع میں کسی دشمنِ اسلام گروہ کے ساتھ ہم رنگی رکھتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے ابھی تک اپنے اندر اپنے اصول و مسلک کو اس طرح محسوس ہی نہیں کیا کہ وہ اپنے آپ کو کفار اور مشرکین کے مقابلے میں ایک جداگانہ حیثیت کے ساتھ نمایاں کرتا اور ان کے ساتھ اپنے آپ کو گڈنڈ کرنے یا ان کی تقلید کرنے میں کراہت محسوس کرتا۔ ایمان کی وہ لکیر ابھی اُس نے کھینچی ہی نہیں جو مومن و کافر کو جدا کر دیتی ہے، جو خدا پرستی اور مخلوق پرستی میں، جو سچ اور جھوٹ میں، جو انصاف اور ظلم میں، جو اصول پسندی اور نبدگی مفاد و اغراض میں، جو حیا و عصمت اور فسق و فجور میں، جو معروف اور منکر میں حد فاصل بن جاتی ہے۔ اس کے اندر اگر اپنے اصول، اپنے دین اور اپنے مسلک کے امتیاز کا شعور بیدار ہوتا تو یہ شعور اس کے مسامحہ سے پھوٹا پڑتا، یہ اس کے چہرے سے ٹپکتا، یہ اس کے لباس اور اس کی وضع قطع میں نمایاں ہوتا، یہ اس کے پسندیدہ آداب و اطوار میں صاف صاف بھلکتا۔ لیکن اگر اس کا پورا ظاہر تشبیہ بالا جانب کی حالت کا مظہر ہے تو وہ گواہ ہے اس کے باطن پر کہ اس کا باطن اس کے اصول و

مسک کی امتیازی حیثیت کے احساس سے خالی ہے۔

پس جہاں تشبیہ ہوگا، وہاں توہل بھی آکے رہے گا اور جہاں توہل موجود ہوگا وہاں کوئی وجہ نہیں کہ تشبیہ نہ پایا جائے۔ یہ دو لازم و ملزوم مقاصد ہیں اور ان میں سے ایک کی حرمت لازماً دوسرے کی حرمت اپنے اندر مضمر رکھتی ہے۔ ایک کی حرمت اگر مسطورہ قرآن میں بیان ہوئی ہے تو دوسرے کی بین السطور میں بیان ہوگئی ہے اور بین السطور کا فہم — کامل فہم اگر ہو سکتا ہے تو نبی و رسول کو ہو سکتا ہے اور وہی مستند شارح ہے اس طرح کے تمام مضمرات قرآنی کا!

نبی و رسول مجرور احکام سنا دینے والا پیادہ (نعوذ باللہ) نہیں ہے بلکہ وہ احکام کی حکمتوں اور مصلحتوں کو سمجھتا ہے، اس کی نگاہ ان کے مقاصد پر ہوتی ہے، وہ ان مقاصد کے لحاظ سے یہ بھی جانتا ہے کہ ایک حرمت لازماً اور کن کن حرمتوں کا تقاضا کرتی ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے شراب پینے کی حرمت کا حکم دیا جاتا ہے اور وہ بہ حیثیت حکیم اور معلم حکمت کے اس کی کشید اور اس کی خرید و فروخت کو بھی حرام ٹھہرا دیتا ہے۔ اوپر سے شراب کو ممنوع ٹھہرایا جاتا ہے اس کے نشہ کو مفسد بیان کر کے۔ وہ نشہ آور مقدار کے ساتھ ساتھ غیر نشہ آور مقدار کو بھی خلاف قانون الہی قرار دیتا ہے، کیونکہ غیر نشہ آور مقدار ذریعہ بن سکتی ہے آدمی کو نشہ آور مقدار تک پہنچانے کا؛ اسے جبریل کے ذریعے حرمت ربو کا حکم ملتا ہے، لیکن وہ ساتھ ہی ساتھ "بیبہ" (وہ معاملہ جس میں سودی معاملے سے مشابہت پائی جائے اور وہ مشکوک نوعیت کا ہو، یا جس سے سود کے بین دین کے چور دروازے نکالے جاسکتے ہوں) کو بھی ناجائز قرار دیتا ہے۔ یہ سب کیا ہے؟

— تعلیم حکمت!

(۳) ترمذی کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: آدمی جب گناہ کرتا ہے تو اس کے قلب رذہن، میں ایک سیاہ نقطہ نمودار ہو جاتا ہے، پھر اگر وہ اس سے باز آ جاتا ہے، تو یہ واستغفار کرتا ہے تو اس کا قلب پھر چلا پاتا ہے۔ اور اگر وہ گناہ کی تکرار کرتا ہے تو وہ نقطہ پھیلتا ہے، تا آنکہ قلب پر چھا جاتا ہے، اور یہی ہے وہ پردہ جس کو اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے۔

یہ روایت بتاتی ہے کہ گناہ کا عمل نفسیاتِ انسانی کی دنیا میں کس طرح واقعہ ہوتا ہے حقیقت کی کیا ہی صاف اور سادہ تعبیر ہے کہ گناہ کا نشو و نما بھی اسی قانون کے عین مطابق ہے جو پوری کائنات میں کار فرما ہے۔ پہلے ایک ننھا سبج پڑتا ہے، اُس بیج کو اگر زمین قبول نہ کرے اور وہ مر جائے تو زمین اپنی اصلی حالت پر قائم رہتی ہے، ورنہ اگر وہ قبول کر لے اور اس کو غذا دینے لگے تو وہ پروان چڑھنے لگتا ہے، ایک تناور درخت بنتا ہے اور اس کی شاخیں زمین پر چھا جاتی ہیں۔ ایک جرثومہ مرض کیا چیز ہوتا ہے؟ خوردبین سے بھی مشکل محسوس کیا جاسکتا ہے۔ وہ بدن میں داخل ہوتا ہے اور بدن فطرۃً اس کی مدافعت کرتا ہے۔ لیکن اگر مدافعت کمزور ہوتی ہے تو وہ اپنی جگہ پیدا کر لیتا ہے، پھر وہ ایک سے دو، دو سے چار ہونے لگتا ہے، یہاں تک کہ جرثوموں کی فوج کی فوج انسانی صحت کی سلطنت پر چھا جاتی ہے۔ گناہ کی ماہیت عمل بھی بالکل ایسی ہی ہے۔

نبی صلعم نے یہ حکمتِ جبریاں فرمائی، یہ ایک لطیف حقیقت جو واضح کی تھی تو یہ محض نکتہ آرائی نہ تھی، یہ ایک ایسے ماحول کے روزمرہ کے عملی تقاضوں کا جواب تھی جس میں بدی اور گناہ کے خلاف نیکی کے سپاہی جنگ لڑ رہے تھے اور اس جنگ کا اولین محاذ خود ان کے اپنے نفوس تھے۔ وہ ضرورت مند تھے اس کے کہ ان کو اپنے عالمِ انفس کی کیفیات کی بصیرت حاصل ہو، وہ محتاج تھے اس کے کہ گناہ کے نفسیاتی عمل کو جانیں۔ چنانچہ خدا کے رسول نے ان کو یہ حیثیت معلّم حکمت کے ان حقائق سے روشناس فرمایا، تاکہ بدی کے اولین جرثومے کے داخل ہوتے ہی ان کی قوتِ مدافعت چوکنی ہو جائے۔

(۴) قرآن میں میدانِ جنگ کے لیے ایک ضابطہ و اخلاق بیان کیا گیا ہے۔ یہ ضابطہ و اخلاق موٹے موٹے اہم اصولوں پر مشتمل ہے۔ ان اصولوں کے اندر ان کے کچھ اپنے تفصیلی تقاضے بھی مضمّن ہیں، لیکن ان تقاضوں کو ان اصولوں کے باطن سے جوں کا توں برآمد کر لینا بدرجہ کمال اگر ممکن ہے تو صرف محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی معصوم بصیرت کے ذریعے ممکن ہے۔ مثلاً آپ کو قرآن میں یہ ہدایت تو صاف صاف لفظوں میں ملتی ہے کہ دشمن سے لڑو مگر زیادتی نہ کرو، زیادتی کا جواب دو مگر شریفاً طریق سے دو، عد سے آگے

نہ نکل جاؤ، لیکن خود اس زیادتی اور اس حد سے نکل جانے کی عملی شکلوں کو قرآن نے نمبر وار فہرست کی صورت میں بیان نہیں کیا ہے، بلکہ یہ کام رسول کے ذمے چھوڑ دیا گیا ہے۔ چنانچہ آنحضرت نے اس زیادتی اور اس حد سے نکل جانے کا مفہوم عملی و تیز میں عملی طریقوں سے وقتاً فوقتاً متعین فرمایا۔ قرآن کی جو حکمت میں السطو میں مخفی تھی اسے اللہ تعالیٰ کے مامور کردہ معلم حکمت نے تنہا کر پیش کر دیا، اشارات کو کھول دیا، الفاظ کے منطوق کو بے نقاب کر دیا، کتاب کے مضمرات کو عام فہم صورت میں پیش کر دیا۔ مثلاً:-

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، فرمایا:-
رسول اللہ کی قیادت میں ہونے والے کسی غزوہ میں میں نے ایک عورت کو مقتول دیکھا، چنانچہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے کی ممانعت فرمادی۔

جب تم میں سے کوئی لڑکے نو اسے چاہیے کہ جو بچے کے چہرے پر ضرب لگانے سے پرہیز کرے۔

حضرت ابو یعلیٰ فرماتے ہیں کہ ہم ایک لڑائی میں عبدالرحمن بن خالد بن ولید کے ساتھ شریک تھے۔ تو ایسا ہوا کہ چار اجنبی دشمن گرفتار کر کے لائے گئے۔ پھر حضرت ابو یعلیٰ نے ان کے بارے میں حکم صادر کر دیا اور وہ باندھ کر تیروں مار ڈالے گئے۔ اس کے بعد حضرت ابو یعلیٰ انصاری نے خبر سنی تو آپ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ کو باندھ کر قتل کرنے سے منع کرتے ہوئے سنا ہے، اس لیے قسم اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ اگر ایک مرغی بھی ہوتی تو میں اسے باندھ کر نہ مارتا۔ اب جو حضرت عبدالرحمن

عن ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، قال
وحدثنا انا مقتولة فی بعض مغازی
رسول اللہ فنبی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
عن قتل النساء والصبيان

والستة الاالنساء،

اذا قاتل احدکم فليجنب الوجه

والشيطان

عن ابی یعلیٰ، قال: عن ونا مع عبد
الرحمن ابن خالد ابن الولید قادی
باوبیة اعلاج من العدو فاصر بهم
فقتلوا صبرا بالنبیل فبلغ ذنک ابایوب
الانصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ، فقال: سمعت
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ینہی عن
قتل الصبیر — فوالذی نفسی بیدہ
لو کانت دجاجة ما صبیرتھا، فبلغ ذلک
عبد الرحمن فاعتق اربع رقایب (ابوداؤد)

(خالد بن ولید) کو اطلاع ہوئی تو آپ نے اس سہو کے کفار

کے طور پر، چار غلام آزاد کیے۔

علاوہ بریں دشمن کی لاشوں کا مثلہ کرنے سے بھی آنحضرت نے منع فرمایا ہے۔

اب ان ارشادات نبوی کو سامنے رکھیے اور پھر سوچیے کہ کیا یہ چیزیں قرآن پر اضافہ ہیں اور اس

کی اصولی ہدایات کے متعارض ہیں یا ان اصولی ہدایات کا ٹھیک عملی تقاضا ہیں؟ کیا قرآن نے جہاں

”اعتداء“ یا زیادتی کرنے سے روکا ہے وہاں یہ سوال خود بخود نہیں پیدا ہو جاتا کہ اعتداء میں کیا امور

شامل ہیں اور کیا اس سے باہر ہیں۔ اور اگر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے تو اس کا ایک قطعی جواب ہونا

چاہیے یا نہیں؟ اگر ہونا چاہیے تو کیا واقعی اس سوال کا پورا جواب قرآن کے الفاظ میں موجود ہے؟ اگر

نہیں تو اس کا جواب دینے والی اتھارٹی کہیں ہونی چاہیے یا نہ ہونی چاہیے؟ اور یہ اتھارٹی اگر رسول

کے پاس ہو جیسا کہ واقعہ ہے تو فرمائیے اس کے خلاف اعتراض کیسے، دلیل کیا ہے، شکایت کیا ہے؟

رسول اللہ قرآن کی ان ساری ہدایات کا کامل شعور رکھتے تھے جو قرآن نے اصولاً دی ہیں، آپ

ان کے مجموعی مزاج کو اس حد تک جانتے تھے جس سے زیادہ جاننا ممکن نہیں ہے، ان کے مجموعی مزاج

کی روشنی میں آپ ان کے تفصیلی عملی تقاضوں کا اتنا مکمل فہم رکھتے تھے کہ کوئی دوسرا اس مقام پر نہیں

پہنچ سکتا۔ بنا بریں آپ ہی احق تھے کہ ”اعتداء“ کا عملی مفہوم واضح فرمائیں۔ اجتہاد اگر کوئی دوسرا آدمی

ایک وقتی فیصلے کے طور پر اعتداء کا صحیح مفہوم پیش کر بھی دکھائے تو چونکہ اس کے اندر شرعاً اتھارٹی موجود

نہیں ہے، لہذا اس کے اجتہاد کا یہ احترام نہیں ہو سکتا کہ دشمن چلبے یہ ساری زیادتیاں مسلمانوں کے ساتھ

کر گزرتے لیکن مسلمان ان سے محض اس بنا پر احتیاط کیے کہ خدا اور رسول کا حکم ہے، یہ ان کا دین ہے اور اس

پر ان کی حاجت منحصر ہے، اور نہ اس اہتمام تقویٰ کا ظہور ہو سکتا ہے کہ ایک صحابی اس حکم کو سننے کے

بعد ایک مرغی کو بھی باندھ کر ذبح کرنے کی جرات نہیں کر سکتے۔

اب ذرا ارشاد ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وی ہوئی ان ہدایات میں سے کونسی ایسی ہدایت

ہے جس کے بارے میں یہ کہا جاسکے کہ یہ تو واضحین حدیث نے گھر گھر ذکر و آیات میں شامل کر دی ہے؟

یا یہ ایک سائش کا نتیجہ ہے جو دین کو تباہ کرنے کے لیے کی گئی تھی، یا یہ قرآن سے ٹکراتی ہے؛ یہ بدایات خود بول بول کر کہہ رہی ہیں کہ ہم میں سے ایک ایک قرآنی ضابطہ جنگ کے فریم میں اپنی جگہ رکھتی ہے اور اس جگہ پر ٹھیک فٹ آتی ہے۔ آپ ان میں سے کس کے مقابلے میں معاملات زمانہ کے تقاضے کے تحت اجتہاد فرما کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کریں گے؛ کیا آپ اب غیر مصافی عورتوں اور بچوں پر تلوار اٹھایا کریں گے؛ کیا آپ دالستہ دشمن کے چہرے پر حزمیں لگایا کریں گے؛ کیا آپ دشمن کو بانڈھ بانڈھ کر لایا کریں گے؛ کیا آپ حریف کے لاشوں کے ناک کان کاٹا کریں گے؛ کیا آپ حکمت نبوی کے جلسے ہوئے ان سارے دیوں کو گول کر کے اپنی حکمت کے بل پر زیادہ بہتر فانوس روشن کر سکتے ہیں؛ لیکن ہتہ کہ آپ اس زعم میں مبتلا ہوں، لیکن قرآن آپ کے اس زعم کو نہیں مانتا، قرآن تو رسول اللہ صلعم کو اپنی حکمت کا معلم مقرر کرتا ہے اور آپ سے مطالبہ کرتا ہے کہ آپ کی حکمت اصل معلم حکمت کی حکمت کے تابع رہے، اگر وہ اس کے تابع نہ رہے تو پھر وہ آپ کی حکمت کو جہالت سمجھتا ہے۔ آپ کتنے بڑے حکمت ماب کیوں نہ ہوں، آپ تعلیم حکمت کی اس مسند پر نہیں بیٹھ سکتے اور اس مسند سے نہیں بول سکتے جو رسول اللہ کے لیے خاص ہے۔

(۵) قرآن نے حکومت و سیاست کے اصول بھی بیان کیے ہیں، اور اتنی وضاحت سے بیان کیے ہیں جتنی کہ "فَصَلِّنَاكَ تَفْصِيْلًا" کے الفاظ کا تقاضا ہے۔ مگر ان اصولوں پر جب آپ عملاً ایک ریاست برپا کرنا چاہیں تو دن رات بے شمار ایسے اصولی مسائل سامنے آئیں گے جن کا جواب الفاظ قرآن میں صاف بطریق سے نہیں ملے گا، لہذا اس کے بیان کردہ، ماسی، اصولوں کے اندر مضمر ہوگا۔ اور صرف ایک گہری نگاہ رکھنے والا علیم ہی یہ اندازہ کر سکے گا کہ یہ اس اصول کن عملی احکام کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ اللہ کا رسول ایسی ہی گہری نگاہ منہ آراستہ تھا اور اس نے سیاسی نظام کے متعلق بعض امور ایسے طے کر دیئے ہیں کہ جن کو اگر کوئی شخص قرآن کے کسی ایک فقرے میں ڈھونڈنا چاہے تو اسے ان کا نام و نشان ہی نہ ملے گا۔ لیکن اگر وہ رسول کی حکمت کی روشنی میں دیکھے تو سارا قرآن انہی امور کے حق میں ناطق ہوگا۔ چنانچہ نبی اکرم نے حوریت کے باقوں میں نظام سیاسی کی زمام اقتدار دیئے جانے کو روکا ہے۔

آج کل کا ایک مجتہد جب احادیث میں اس ممانعت کو پڑھے گا تو وہ ضرور ہیچ و تاب کھائے گا اور

پھر وہ انڈکس کے ذریعے قرآن کی مدق گردانی کر کے جب پوری طرح مطمئن ہو جائے گا کہ اس طرح کی لغت قرآن کے کسی فقرے میں نہیں آئی تو وہ کہے گا کہ یہ روایات قطعی طور پر تلاؤں کی سازش ہیں، آخر خدا کے دین میں کوئی ایسی ممانعت کیوں کر ہو سکتی ہے جو اس روشن دور کی ترقی یافتہ اقوام کو پسند نہ ہو۔ لیکن اللہ کے رسول نے یہ ممانعت جو کی ہے تو اس عظیم الشان حکمت کے بل پر کی ہے جو معرفت قرآن میں اسے مقام محمود پر لاکھڑا کرتی ہے۔ وہ جس قرآن کو لایا ہے اس میں خواتین کے لیے صاف صاف ہدیت موجود ہے کہ "وَقَدْ نَبِيٌّ يُّبَيِّنُ لَكِنَّ" یعنی ان کے سرگھروں کی سلطنت کو چلانے کا بار ڈال کر ایک خاص تقسیم کار کی گئی ہے۔ پھر وہ ہی قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ "الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ" یعنی مرد عورتوں پر قوام ہیں اور یہ قوامیت ان کو اپنی فطری فضیلت کی وجہ سے دی گئی ہے۔ اور اللہ کا رسول ان اشارات سے اسلامی سماجی نظام کا پورا پورا تصور اپنے سامنے رکھ کر جب سوچتا ہے تو وہ حکمت کا تقاضا ہی پاتا ہے کہ عورتوں کو سیاست سے مستثنیٰ رکھا جائے۔ وہ پوری طرح سمجھ جاتا ہے کہ اگر گھروں کے اندر مرد عورتوں کے لیے قوام میں تو ریاست کی مجموعی قوامیت کے لیے بھی مرد ہی موزوں ہو سکتے ہیں خواتین نہیں۔ کوئی ایسا نظام معقول طریق سے نہیں چل سکتا جس میں خاندانی اور معاشرتی قوامیت مردوں کے ہاتھ میں ہو، لیکن سیاسی قوامیت عورت کے سپرد کر دی جائے۔ یہ کھلا ہوا تضاد ہو گا۔ وہ عورتوں کی ان صلاحیتوں کی پوری حقیقت قرآن سے اخذ کر لیتا ہے جن کو اگر ان کے مناسب فطرت کاموں میں لگایا جائے تو بہترین نتائج برآمد ہونگے۔ لیکن اگر ان کے مناسب فطرت کاموں سے ہٹا کر ان کو سیاست پر لگا دیا جائے تو کبھی خیر کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اس لیے جب وہ خواتین کو سیاست سے مستثنیٰ کرنے کے لیے کوئی بات زبان سے کہتا ہے تو وہ از خود نہیں کہتا بلکہ حقیقت قرآن ہی اس کی زبان سے بولتا ہے، قرآن اس کی زبان سے اپنے اصولوں کی ضروری توضیح کرتا ہے، اور وہ اگرچہ قرآن کی کوئی آیت پیش نہیں کر رہا مگر وہ قرآن کی کسی آیات کا مجموعی اقتضا بیان کر رہا ہوتا ہے۔

پھر اس معاملے میں بات صرف لفظی ممانعت ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ اگر یہ لفظی ممانعت ہمارے سامنے نہ بھی آئی ہوتی تو وہ پوری سوسائٹی جو کہ نبی مسلم نے اپنے ہاتھوں سے تعمیر فرمائی تھی اپنے سیاسی

نظام کے معمول کے ذریعے قرآن کی عملی تعبیر اسی طرح پیش کرتی ہے کہ ایک سلیم الطبع آدمی کا ذہن اس ممانعت تک پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن اب جبکہ یہ لفظی ممانعت موجود ہے اور اس کی لپیٹ پر لوگوں کی ایک مسلم سوسائٹی کا تعامل اس کے حق میں ہے اور اس تعامل کے پیچھے پورا عقلی استدلال فراہم کرنے کے لیے قرآن کی آیات موجود ہیں تو کوئی احمق ہی یہ جرات کر سکتا ہے کہ آنحضرت کی اس ممانعت کے بارے میں یہ کہے کہ یہ کوئی سازشی روایت ہے یا یہ وقتی اجتہاد تھا، یا اس کی کوئی شرعی اہمیت نہیں ہے، یا یہ قرآن پر اضافہ ہے، یا یہ ہمارے لیے محبت نہیں ہے!

(۶) قرآن میں اسلامی ریاست کے امیر مملکت، اصحاب شوریٰ اور دوسرے عہدہ داروں کے بارے میں اگر کوئی معیار انتخاب ملاحظہ ہے تو وہ صرف اتنا ہے کہ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ۔ اور یوں درحقیقت سب کچھ اس کے اندر مضمر ہے۔ لیکن اس رہنما اصول کے معنرات میں سے ایک کو نبی صلعم یوں بے نقاب فرماتے ہیں:-

نحن والله لا نؤتی علی هذا العمل
احدا طلبد بحرص علیہ
خدا کی قسم ہم اس ذمہ داری کے اوپر کسی ایسے شخص کو
مأمور نہیں کرتے جو اسکی تمنا کو سے یا اس کی حرص رکھتا ہو۔

یہ روایت تمہا نہیں، متعدد دوسری روایات ہیں جو طلب منصب، امید داری عہدہ اور خواہش جاہ کا سدباب کرتی ہیں۔ خالص قرآنی اسلام کا ایک علمبردار تو کھٹ سے اس پر یہ کہہ دینگا کہ یہ رذلوں کا قرآن پر اضافہ ہے، قرآن نے اس قسم کی کوئی بات نہیں کہی۔ ہاں! آپ بلاشبہ قرآن سے اس طرح کی بات اخذ نہیں کر سکتے لیکن خدا کا رسول تو قرآن میں یہ پالیتا ہے کہ خواہش منصب تقویٰ کے منافی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کن مقاصد کے لیے، کن اصولوں پر اور کن حدود کی پابندی میں اسلامی حکومت کو کام کرنا ہے، چنانچہ یہ مقاصد، یہ اصول اور یہ حدود من حیث المجموع یہ بات بول بول کے کہہ رہے ہیں کہ ہمارے مطلب کی کوئی حکومت جاہ پسند لوگوں کے ذریعے نہیں چل سکتی، ہمارے تقاضے تو ایسے ہی لوگوں سے پورے ہو سکتے ہیں جو مناصب کی ذمہ داریوں کے بوجھ کا احساس رکھنے کی وجہ سے ان سے کوسوں دُور بھاگتے ہوں، لیکن یہ بوجھ ان کے اوپر اس معاشرے کی طرف سے لا دیا جائے۔ بخلا

اس کے اگر جاہ طلب لوگ آگے آجائیں جو حصولِ مناصب کے لیے باہم کشمکش کرنے والے، روپیہ لگانے والے اور جوڑ توڑ کرنے والے ہوں تو ان مقاصد کا، ان اصولوں کا اور ان حدود کا خون بہنے کے رہے گا جن پر اسلامی حکومت چلتی ہے۔ آج دنیا میں جمہوریت کو ناکامی تک پہنچانے کا ذریعہ جو اسباب بنے ہیں ان میں سے ایک نمایاں سبب امیدواری اور طلبِ مناصب کا فتنہ ہے۔ قرآن کا فلسفہ سیاست اس کا تحمل نہیں، قرآن کے پیش کردہ نظامِ حکومت کے مزاج سے یہ سازگار نہیں، اسلامی معاشرے کی فطرت اس کے لیے سازگار نہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے کہ جس کا ادراک نبی اللہ کی دی ہوئی خاص حکیمانہ بصیرت سے کرتا ہے اور پھر وہ جاہ طلبی کی روک تھام کے لیے جو نہی کرتا ہے وہ اگرچہ اس کے اپنے الفاظ میں ہے لیکن عین مثلث قرآنی اس سے پورا ہوتا ہے۔

(۷) آپ کو معلوم ہے کہ مدینہ کے اسلامی معاشرہ کے سامنے ایک اہم سوال منافقین سے نپٹنے کا رہا ہے۔ عین ایمر جنسی کے حالات میں ایک عنصر غداری، تخریب اور سازش کی کاروائیوں میں لگا رہتا تھا۔ ظاہرات ہے کہ نفاق ایک اہم موضوع بن جانا چاہیے تھا، چنانچہ قرآن مجید میں بیشمار مقامات پر منافقین اور ان کے نفاق پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ خود نبی صلعم کی مجلس میں بھی اس موضوع پر گفتگوئیں ہوتی ہی چاہیے تھیں اور اب احادیث میں بھی اس موضوع پر سرایتہ روایات کچھ نہ کچھ ہونا چاہیے۔ اسی سرایتہ روایات میں ایک چیز یہ بھی پائی جاتی ہے:-

چار چیزیں ایسی ہیں کہ جس شخص میں پائی جائیں وہ	اربع من کن فیہ کان منافقا
خالص منافق ہے اور جس میں ان میں سے کوئی ایک	خالصا ومن کان فیہ خصلۃ منہن
موجود ہو تو گویا اس میں نفاق کی ایک خصلت ہے تاقتیک	کان فیہ خصلۃ من النفاق حتی یدعما
وہ اس سے باز نہ آجائے:- ایک یہ کہ جب بھی اس پر	اذا اؤتمن خان واذا حدث کذب
بھروسہ کیا جائے وہ خیانت دکھائے، دوسرے یہ کہ جب	واذا عاہد غدرا، واذا خاصم فخر
بھی بات کرے جھوٹ بولے، تیسرے یہ کہ جب بھی وعدہ	راحمۃ

کرے تو وعدہ خلافی کرے، چوتھے یہ کہ جب بھی جھگڑے تو فحش پر اتر آئے۔

قرآن نے منافق کے کردار کو کسی مقام پر اس شکل میں نمایاں نہیں کیا ہے، لیکن قرآن نے منافقین کا ذہنی تجربہ جس طرح کیا ہے، اُس پورے کو اگر اس روایت کے سامنے رکھا جائے تو وہ اس کی تصدیق کرتا ہے۔ خالص منافق عقائد کے لحاظ سے جس مقام پر ہوتا ہے اس سے ٹھیک وہی خصائل پیدا ہونے چاہئیں جن کو یہ روایت اپنے اندر لیے ہوئے ہے اور یہ خصائل جہاں بھی پائے جائیں اس حقیقت ایمان کا فقدان خود بخود مفہوم ہو جاتا ہے۔ لیکن اس حقیقت تک آج ہم اس سہولت کے ساتھ اگر پہنچ سکتے ہیں تو محض اس وجہ سے کہ اللہ کے رسول نے اپنی حکمت بالغہ کے ذریعے اس پر سے نقاب اٹھا دیا ہے۔ یہ نبی کی حکمت تھی جس نے چند ظاہری خصائل کے پیچھے کام کرنے والی نفسیاتی اور قلبی حالت کو مبرن کر دیا۔ اب یہ حقیقت ایک دینی حقیقت ہو گئی، اب آپ اسے وقتی رائے کہہ کر بدل نہیں سکتے۔ یہ توضیح حقیقت اللہ کے رسول نے معلم حکمت ہونے کی حیثیت سے فرمائی ہے۔

ایسی بے شمار احادیث ہیں سے جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تعلیم حکمت کے منصب سے کلام کرتے ہیں، یہ چند مثالیں جو ہم نے پیش کی ہیں ان پر غور کرنے سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ آنحضرت کی حکمت قرآن سے الگ اور قرآن پر اضافہ کرنے والی نہیں بلکہ قرآن کے ہی منشا کو واضح تر کرنے والی اور اس کے باریک تقاضوں کو نمایاں اور اس کے بین السطور کو کھلی کرنے والی ہے۔ آنحضرت اپنی طرف سے کوئی بات گفٹ کر نہیں فرماتے بلکہ معلم حکمت ہوتے کی حیثیت سے ٹھیک وہی کچھ فرماتے ہیں جو قرآن کا اپنا ہی مقتضی ہوتا ہے۔ یہ منصب کسی دوسرے کا نہیں ہو سکتا، کہ وہ زمانے کے حالات کے بدل جانے کی بنیاد پر اس منصب سے خدا کے رسول کو ہٹانے اور خود آپ کی جگہ لینے یا کسی دوسرے کو یہ جگہ دلانے کا مدعی بنے۔

(باقی)

اسلامی نظام تعلیم اور پاکستان میں اس کے نفاذ کی عملی تدابیر

مولانا مودودی کی وہ معرکہ الآراء تقریر جو انہوں نے جمعیت طلباء کے ایک اجتماع میں فرمائی۔

قیمت ۵ روپے ملنے کا پتہ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان اچھرہ لاہور